R. No. 2 [illegible]/57

Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
[illegible]

ٹیلیفون ۔ [illegible]
[illegible]

جلد ۲۴ ۔ شمارہ ۴۰ | ایڈیٹر:- آل احمد سرور | ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء

اداریہ

قومی یک جہتی کیسے بڑھے

۲ اکتوبر کو سارے ہندوستان میں قومی ایکتا دن منایا گیا۔ تین سال پہلے جب چین نے ہماری سرحد پر جارحانہ قدم اٹھایا تھا تو پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں پورے ملک نے نہایت جوش و خروش سے ملک کی حفاظت کے لیے اور اس کی عزت و سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے عہد کیا تھا اور ملک کے اندر یک جہتی اور امن و امان قائم رکھنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ جمہوریت کی زندگی کے چھوٹے بڑے اختلافات کے باوجود جب پاکستان نے ہماری سرحد پر جارحانہ کارروائی کی اور کشمیر میں مداخلت کار بھیج کر ملک کی سالمیت کو مجروح کرنا چاہا تو پورے ملک نے ایک ہو کر اس نئے خطرے کا مقابلہ کیا اور ہمارے دشمنوں کو معلوم ہو گیا کہ ہندوستان اپنے ہر دشمن کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ اب اگرچہ باضابطہ گولی چلنی بند ہو گئی ہے، مگر پاکستان کی طرف سے برابر چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے اور ہمارے سکون اور ضبط کی آزمائش کی جا رہی ہے۔ اس جنگ نے یہ تو دنیا کو دکھا دیا کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے ماننے والے، مختلف بولیاں اور زبانیں بولنے والے، مختلف علاقوں کے رہنے والے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے کس طرح سینہ سپر ہو سکتے ہیں۔ گویا خطرے نے اتحاد پیدا کر دیا ہے اور یک جہتی کی فضا قائم کر دی ہے، مگر ہمیں اس یک جہتی کی لے بڑھانی ہے۔ اس اتحاد کو اور مضبوط کرنا ہے اور جنگ و صلح ہر حال میں اپنی طاقت میں اس طرح اضافہ کرنا ہے کہ کوئی ہمارے ملک کی طرف بری نظر نہ ڈال سکے۔ اس یک جہتی کے لیے ہمیں اپنے اصولوں پر ہر وقت دھیان دینا چاہیے، جمہوریت، سیکولرازم، سوشلزم کی منزل کی طرف قدم، یہ ہماری زندگی کے بنیادی اصول ہیں انھیں پر عمل کرنے سے ہماری یک جہتی اور مضبوط ہو گی۔ انھیں سے ہمیں اگلی جد و جہد کے لیے نیا ولولہ ملے گا، انھیں کے ذریعے سارے ملک کی آبادی اپنی ساری صلاحیت ملک کی خدمت کے لیے وقف کر سکے گی، گویا یک جہتی اپنے اصولوں پر عمل سے آتی ہے کیونکہ اس طرح سب کو ان اصولوں کی طاقت کا علم ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے بچاؤ کے لیے ضروری ساز و سامان بھی تیار کرنا ہے اپنی ضروریات کے لیے غذا بھی فراہم کرنا ہے، اپنی قومی پیداوار بھی بڑھانی ہے، مگر ان کاموں پر بھی پوری توجہ جمہوریت اور سیکولرازم کے اصولوں پر عمل کر کے ہو گی۔ یہی ہمارے میکدے کی کلید اور یہی ہمارے سارے مسائل کا حل ہے۔ اسی طرح ہم گاندھی اور نہرو کے نقش قدم پر چل سکیں گے اور اپنے دیس کو ترقی اور خوشحالی کی اونچی سے اونچی منزل تک لے جا سکیں گے۔ ہمیں ہر کام اس نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے اور اپنے روز مرہ کے معاملات میں بھی اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کسی طرح ہمارے کسی اقدام سے جمہوریت اور سیکولرزم کو زک نہ پہنچ سکے۔

شولوخوف کو نوبل انعام

اب کے نوبل انعام شولوخوف کو ملا ہے۔ اس سے پہلے جب پاسترناک کو نوبل انعام دیا گیا تھا تو یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ شاید یہ اس کی ادبی اہمیت کا اتنا اعتراف نہیں جتنا سرد جنگ جاری رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ غالباً اسی لیے پاسترناک نے خود انعام لینے سے انکار کر دیا۔ مگر اب کے شولوخوف کو جو انعام ملا ہے وہ واقعی اس کی بلند پایہ تصانیف "اور دون بہتا رہا" اور

اس شمارے میں

VIRGIN SOIL UPTURND "کنواری دھرتی" کی عظمت کا اعتراف ہے۔ "ڈان بہتا رہا" اور "کنواری دھرتی" دونوں شولوخوف کی حقیقت نگاری، اس کی کردار نگاری، اس کی اپاہاک کی وسعت اور اس کی انسان دوستی کی بڑی اچھی مثالیں ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ روس کے اس بزرگ ادیب اور عالمی شہرت رکھنے والے فن کار کی عظمت کا نوبل انعام کے ذریعے اعتراف کیا گیا۔ شولوخوف صرف روسی ادیب ہی نہیں وہ ایک عالمی ادیب اور فن کار کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہار کے ایک بزرگ صوفی مصنف کا انتقال

آنگلہ گیا۔ ۱۳ ر نومبر ۱۹۶۵ء۔ آج یہاں شاہ اختر حسین الملقب بہ شاہ بیراگ چشتی صابری کا انتقال تین بجے شب میں ہو گیا۔ آپ بہار کے ایک بزرگ، صوفی اہل قلم تھے۔ آپ کو حضرت امام الاولیا سید شاہ تصدق علی عرف شیر شاہ تیز رفتار رحمۃ اللہ علیہ سیوان سے شرف بیعت حاصل تھا۔ آپ بابا خلیل داس بنارس کے ہم مشرب تھے۔ آپ نے تصوف اور مسائل شریعت اور طریقت کے بہت سے غیر مطبوعہ قلمی نسخے چھوڑے ہیں۔ مطبوعہ کتابوں میں جلوۂ شریعت اور جلوۂ حقیقت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ سراپا اخلاق، محبت، مروت اور جملہ اوصاف انسانی کے نمونہ تھے۔ آپ ہندوستان کے مشہور طنز نگار جناب مانپوری مرحوم کے اپنے بھتیجے اور معین شاہد مدیر حور چہ گیا اور قیوم خضر ایڈیٹر "شادؔ" پٹنہ کے والد بزرگوار تھے۔ جنازہ کی نماز میں سیکڑوں معتقدان، محبان نے شرکت کی۔

انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۶۶ برس تھی۔

(نامہ نگار حور چہ گیا)

وزیر اعظم کی تقریروں کا دوسرا مجموعہ

۱۱ راکتوبر۔ وزیر اعظم جناب لال بہادر شاستری نے اس برس ۱۳ راگست تا ۲۶ ستمبر کے دوران میں جو تقریریں کیں انھیں کتابی صورت میں شایع کر دیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ وزارت اطلاعات و نشریات کے پبلیکیشنز ڈویژن نے حال ہی میں جاری کیا ہے۔

یہ وزیر اعظم کی تقریروں کا دوسرا مجموعہ ہے جو ملک کو درپیش چین اور پاکستان کے خطرے سے متعلق ہے۔

روسی ادیب شولوخوف کو نوبل انعام

اسٹاک ہام ۱۶ راکتوبر۔ روسی ادیب میخائیل شولوخوف کو سنہ ۱۹۶۵ء کے لیے ادب نوبل پرائز دیا گیا ہے۔ یہ انعام ان کے مشہور ناول "اور ڈان بہتا رہا" پر دیا گیا ہے۔ اس ساٹھ سالہ روسی ادیب کو ۳۰۴۲۰ ۱ اسٹرلنگ کا انعام دسمبر میں دیا جائے گا۔ یاد رہے کہ اس سے پہلے "ڈاکٹر ژواگو" کے مصنف بورس پاسترنک کو ۱۹۵۸ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا تھا لیکن انھوں نے انعام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میخائیل شولوخوف دوسرے روسی ادیب ہیں جنھیں ادب کا نوبل پرائز دینے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند شعبۂ اردو جموں کے صدر

کشمیر یونیورسٹی کا ایک شعبۂ اردو کئی سال سے سری نگر میں موجود ہے ہی اس کے علاوہ اس سال سے یونیورسٹی نے ایک اور شعبۂ اردو جموں میں کھول دیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جو اب تک بھوپال میں شعبۂ اردو کے صدر تھے شعبۂ جموں کے صدر مقرر ہوئے ہیں۔ انھوں نے ۱۵ راکتوبر کو جموں میں چارج لے لیا ہے ان کا ڈاک کا پتہ یہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند
پروفیسر اردو جموں ۔ کشمیر یونیورسٹی جموں (کشمیر)

تلگو ادیب پی گنشی نرسمہا راؤ کا جشن صد سالہ

حیدر آباد ۱۲ راکتوبر۔ شری پی ایس آر اپا راؤ کنوینر سیکریٹری شری پنو گنٹی لکشمی نرسمہا راؤ جشن صد سالہ تقاریب کمیٹی نے اطلاع دی ہے کہ حکومت نے مشہور تلگو ادیب جناب پنو گنٹی لکشمی نرسمہا راؤ جشن صد سالہ تقاریب کمیٹی مقرر کی ہے۔ حکومت نے ہدایت کی ہے کہ کمیٹی کو پورے صوبے میں خاص طور پر ثقافتی مراکز میں تقاریب منعقد کرنے چاہئیں انھوں نے صحافت کا شکریہ ادا کیا ہے کہ اس نے کمیٹی کے ساتھ تعاون کیا اور خواہش کی ہے کہ اخبارات مرحوم کی زندگی پر موصولہ مضامین اور فیچر بھی چھاپیں۔ کمیٹی نے حیدر آباد میں ۳۱ راکتوبر کو جشن صد سالہ منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ (ملاپ)

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں نظام توسیعی خطبات کا انعقاد

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو اعلیٰ حضرت نظام دکن نے تینتیس ہزار روپے کی گرانقدر رقم عطا فرمائی ہے۔ نظام کی مجلس اوقات کی اس عطا کردہ رقم سے دہلی یونیورسٹی میں نظام توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع ہوگا اور ہر سال ملک کے مقتدر اہل علم کو شعر و ادب کے مختلف اہم موضوعات پر خطبات دینے کے لیے مدعو کیا جائے گا۔

۱۹۶۶ء میں دیے جانے والے خطبات کے لیے ملک کے کسی ممتاز عالم کا انتخاب کیا جائے گا اس سلسلے میں ہر سال مبلغ دو ہزار روپے خرچ ہوں گے جن میں سے ایک ہزار روپے فاضل مقرر کی خدمت میں ان کے خطبات پر پیش کیے جائیں گے اور ایک ہزار روپے ان خطبات کی طباعت پر صرف ہوں گے۔

دہلی یونیورسٹی کے چانسلر اور جمہوریہ ہند کے نائب صدر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے افتتاح کرنے کی درخواست منظور فرمائی ہے۔

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)
صدر شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

کاشف الہاشمی ادونی

غالب کا ایک شاگرد ــــــ محمد حسین محمود

"ہماری زبان" کی ۲۲ نومبر ۱۹۹۴ء کی اشاعت میں صفحہ ۳ و ۴ پر اس عنوان کے تحت ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کا ایک معلوماتی مضمون شایع ہوا ہے۔ غالب کے تلامذہ میں محمود کا کیا مقام ہے یا دنیائے شعر و سخن میں اس کی کیا حیثیت ہے، مجھے اس سے بحث نہیں۔ اپنے مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے محمود کی تین تصنیفات کا ذکر فرمایا ہے۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مثنوی تحفۂ محمود:۔ بحوالہ "تلامذۂ غالب" مصنفہ مالک رام

۲۔ حلوائے بے دود:۔ درسی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ایک ۴۹ صفحات کی نثری کتاب۔ مطبوعہ مطبع نولکشور۔ سال طباعت کا ذکر نہیں۔

۳۔ محمود نامہ اردو:۔ ۱۷ صفحات کا دیوان ہے۔ سرورق یا آخر کتاب کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس کا شاعر کون ہے۔ مطبوعہ ۱۲۹۰ھ مطبوعہ مطبع گلزار محمدی واقع لکھنؤ۔

محمود نامۂ اردو کے دو اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ تصنیف محمد حسین محمود کی ہے اور وہ اشعار درج ذیل ہیں۔

وہ جانتے ہیں محمد حسین ہے محمود
بُرا کہیں ہیں مگر میرے روبرو مجھ کو
غلام غوث علی ہوں اسد کا ہوں شاگرد
ہو کس طرح نہ مرے نعرۂ جگر کو فروغ

ڈاکٹر صاحب نے محمود نامۂ اردو کے ۳۲ اشعار اپنے مضمون میں شامل فرمائے ہیں جو محمود کی ۳۲ غزلوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ ہر شعر حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار ہے۔ ان اشعار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ شاعر نے شعر کے شروع اور آخر میں ردیف کا لحاظ رکھا ہے۔ مثلاً

دم تو دیتا تمہیں ہر بات میں خوب آتا ہے
دی کبھی تم نے نہ محمود کے اشعار کی داد
زندگی تلخ ہو فرہاد کو کیوں کر نہ بھلا
دل میں شیریں کے ہو جب پیدا رخِ خسرو آمیز
فرق ہو دل میں تو ہے شفقت مادر بے لطف
ہوں نہ مرتی کے تو ہیں خویش برادر بے لطف
گفتگو کرنے سے کھلتا ہے سیہ اور سفید
ایک ہے ورنہ رخِ کافر و دیندار کا رنگ
یہ خبر تھی کیسے اے شوخ ستمگر معلوم
دل تجھے دے کے بھی تنت کش ہجراں ہوں گے

غرض ڈاکٹر صاحب کے مضمون کے ذریعہ ہم محمد حسین محمود کی تین تصنیفات سے متعارف ہوتے ہیں جن میں سے مثنوی تحفۂ محمود سے بحوالہ "تلامذۂ غالب" اور حلوائے بے دود اور محمود نامۂ اردو خود ڈاکٹر صاحب ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

میری چھوٹی سی لائبریری میں ایک کتاب ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سرورق:۔ بعون صناع مکین و مکاں و تفضل خلاق جہاں محمود نامہ در مطبع نامی منشی نولکشور بطبع مزین مقبول طبع شد۔

صفحہ ۲ لغایت ۱۹:۔ فارسی کی ۳۱ غزلیات، حواشی پر معمولی طور پر تشریح الفاظ۔

آخری صفحہ (۲۰):۔ خاتمۃ الطبع الحمد للہ کہ نسخۂ مفید عامہ مسمی بہ محمود نامہ بماہ اکتوبر ۱۸۷۳ء مطابق رمضان ۱۲۹۰ھ در مطبع نامی منشی نولکشور صاحب بمقام لکھنؤ طبع شد۔

یہ کتاب شاعر کی فارسی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ۲۰ صفحات کی اس کتاب میں فارسی حروف تہجی کے مطابق ہر ایک حرف کی ردیف میں ایک غزل شامل ہے۔ صرف "گ" کی ردیف کو چھوڑ کر کل ۳۱ غزلیات ہیں "گ" کی کمی "ک" کی ردیف میں پوری کی ہے اسی طرح "ج" کی ردیف میں دو اشعار ایسے ہیں جو "چنان اور چو" سے شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ "چ" کی ردیف میں پوری غزل موجود ہے۔ ہر غزل میں ۷ اشعار ہیں، ایک مطلع، ۵ درمیانی اشعار اور ایک مقطع۔ اکثر مقطعوں میں محمود و ایاز کی روایتی محبت کا تذکرہ ہے ہر ایک غزل کا ہر شعر اسی حرف سے شروع ہوتا ہے جس کی ردیف میں وہ غزل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مضمون پڑھنے اور خصوصاً محمود نامۂ اردو کے منتخب اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد خیال آیا کہ ممکن ہے محمود نامہ (فارسی) کا مصنف بھی وہی محمود ہو جس کا نام محمد حسین ہے جب محمود نامہ اردو اور محمود نامہ کا سال طباعت ۱۲۹۰ھ ہجری اور محمود نامہ کے اشعار کی روش محمود نامۂ اردو کے منتخب اشعار سے ملتی جلتی پائی تو سوچا کیوں نہ اس سے ارباب فکر و نظر کو متعارف کرایا جائے۔

محمود نامہ (فارسی) کی تفصیلات اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اب اُس کی ایک پوری غزل اور باقی غزلیات میں سے ایک ایک شعر پیش کر رہا ہوں۔

اے داغ بر دل از غم خال تو لالہ را
شرمندہ ساخت آہوئے چشمت غزالہ را
از انفعال حل ایت لالہ در چمن
دیگر بدست خویش نگیرد پیالہ را

اگر شگفت شاہد گل گرچہ صد ہزار
بلبل ز روئے درد کشید آہ و نالہ را
آمد بروں بگرد رخت خطِ عنبریں
کس گرد مہ ندیدہ بگو بہ ہالہ را
آساں ز خوانِ وصل تو کس بہرہ نیافت
مشکل تواں گرفت بدست ایں نوالہ را
اوصافِ گل ز بلبل بیدل تواں شنید
چوں شبلی او ندید کسے ایں رسالہ را
آزردہ کے کند دل محمود را ایاز
نیکو کند مطالعہ گر ایں قبالہ را
باز ایاز از دلِ محمود برد !
صبر و قرار و خرد و خورد و خواب
پند ناصح میکند از بادہ ام آب چہ سود
میکند ساقی حوالہ گاہ راس دگاہ چپ
تنگ در بر گرفت ہر کہ ترا
دلِ او شاد و کام او حسن است
ثمنِ مئے مغانہ دہم نقدِ جاں اگر
باشد ز دستِ آں بتِ خمار الغیاث
جمالت را ہزاراں صاحب تاج
بیک دیدن بجاں ہستند محتاج
چناں مائل شدم بر حسن جاناں
کہ جز ذکرش نہ دارم بر زباں ہیچ
حدیثِ توبہ و تقویٰ مپرس از محمود
دہد ایاز چو او را دے دو چار قدح
خورش از دستِ او دارد پیراں
کسے کم دید شبلیِ آں جوان شوخ
درد بلا ہر کہ او زباں دارد
وصفِ رخسار یار می گوید
دلِ ایاز زدہ محمود دستِ شوق
چوں آمدہ گرفتن دلِ بتاں لذیذ
روز تا شب در آتشِ ہجرم
وقنا ربنا عذاب النار
زدم چو بوسہ برآں لب بگیرم آں سرِ زلف
کہ باد دورِ مئے لعل را تسلسل نیز
تراز خطائی میکند با ما رقیب !
ماچہ غم داریم گو میخاے ز تاش
سخت غمناک شد ترا کہ گرد شادِ دل
شادیِ خاطرِ دل گیر تو میباشد دلبس

شاد کے گردد دلِ غمگین من بے روئے دوست
خرم آں ساعت کہ بینم روئے یار دیگرش
صاف مئے محمود را روزے اگر بخشد ایاز
از غم دوراں شود آں بے سر و ساماں خلاص
ضرورت است کہ حال ترا بیار کنم عرض
غمِ نہانِ تو ایدل بآشکار کنم حرص
طورِ دنا پیش گیر رسم جفا را گذار
زانکہ ز خوباں خوش است در ہمہ جا ایں نمط
ظاہر اگر می بر آید از تو امید کسے
ناامیدی چوں بود امیدوارانم حفظ
عمر باشد از گناہ آں کہ لابِ حسین زد
ہست او میزاں بہ پیش بر سر بازار شمع
غایب از دیدہ غمزدہ اگر گرد دیار
زود باشد کہ نہد بر دل بے ساماں داغ
فرق در صومعہ و دیر مغاں نیست اے شیخ
گرچہ محمود سوئے دیر روم دار مساجد
قبول کن کہ نالہ اگرچہ باشد سنگ
بگوشِ ہر کہ رسد ہمچو من صد آفاق
گوہر ہر کس و ناکس شود از مئے پیدا
نتواں یافت دگر بہ ز مئے لعل نمک
لب لعلِ تو ہست آرام دل
بر آید از دعا قسمت کام دل
بپیل اے دل بسوئے سنبل و گل
بدورِ زلف و روئے آں گل اندام
نظم تو محمود عجب ساختہ
نام تو مشہور بہ ہر انجمن

دردِ من نیست بجز ناموس تو جاں دارم
ہیچ دگر در دلِ محمود نیست!
یوسفِ مصری کہ بہ بو کبود حیراں مردود

مونسِ جانِ حزیں دیدہ گریاں ہیچو
جز غم تو روز و شب و ساں و ماہ
کا شکے درد و رہ آں رخسار بود کا شکے

تقاضائے وقت

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

دیش کی آن پہ ہنستے ہوئے مرنا ہوگا
لاکھ دشوار سہی کام یہ کرنا ہوگا
سوزشِ حبِ وطن داخلِ ایماں ہے اگر
اس میں ہی تپ کے ہمیں رنگ نکھرنا ہوگا
تیرگی جبرِ سیاست کی مٹانے کے لیے
مثلِ خورشیدِ درخشندہ ابھرنا ہوگا
مادرِ ہند کی تقدیس بچانی ہے ہمیں
زر تو کیا شے ہے دل و جاں سے گزرنا ہوگا
دوستو اپنا چمن ہم سے لہو مانگے ہے
اس کا دامن ہمیں دل کھول کے بھرنا ہوگا
جن حریفوں نے ہمیں چھیڑ کے للکارا ہے
ان کو پامال بصد حوصلہ کرنا ہوگا
پاک ہو کر جو اتر آئے ہیں ناپاکی پہ
اپنے ہاتھوں انھیں اک روز سدھرنا ہوگا
سر پھرے سرکشوں نے سر تو اٹھایا ہے مگر
اپنے قدموں پہ سر آخر انھیں دھرنا ہوگا
نوجواں اپنے بگولوں کی طرح اٹھے ہیں
صفِ اعدا کو بہر طور بکھرنا ہوگا
راہِ الفت بڑی پُر پیچ و خطر ہے یارو
کچھ بھی انجام ہو اس رہ سے گزرنا ہوگا
لاکھ طوفان بلا خیز سہی اے منشاؔ   ہمیں ہر حال میں اس پار اترنا ہوگا

اب سبھی سے ہے کام کا

کرشن موہن

گو دیا ہے شانتی سندیش میرے دیش نے
آن کی رکشا میں کر سکتا ہے یہ سنگرام بھی
وقت پڑنے پر دکھا سکتے ہیں ہم سنسار کو
یدھ کر سکتے ہیں، تج سکتے ہیں ہم آرام بھی
آج اپنی دیش بھگتی میں ہے شکتی کا ظہور
آج پختہ ہو چلا ہے اپنا جوشِ خام بھی
جان و دل پر آج طاری ہے شجاعت کا سرور
کس قدر ہے کیف زا حبِ وطن کا جام بھی
ہم بھی ہو جائیں امر اپنے جوانوں کے طفیل
تا ابد زندہ رہے ہندوستاں کا نام بھی
اپنی دھرتی پر پڑی ہے جب سے لالچ کی نظر
جنگ کا نعرہ بنا ہے امن کا پیغام بھی
کر چکے آرام کافی اب سبھی سے ہے کام کا   کرشن موہن زندگی آرام بھی ہے کام بھی

معیاری زبان

ڈاکٹر گیان چند جین

زبان بولیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن جب ہم کسی کتاب میں ہندی، اردو یا انگریزی زبان کے نمونے پڑھتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ الفاظ اس زبان کی ہر بولی کا مشترک حصہ ہیں۔ نہیں بلکہ یہ کتابی زبان بھی ایک بولی کی منزہ صورت ہے جو بعض غیر لسانی وجوہ سے زیادہ موقر ہو گئی ہے۔ کسی زبان کی سب سے اہم بولی کو معیاری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ بولنے والوں کی یا مقام کی حیثیت سے کوئی بولی اہم ہو کر معیاری ہو جاتی ہے معیاری زبان کے تعین میں اور دوسری بولیوں کی تقابلی اہمیت میں ذیل کے اسباب میں سے کوئی ایک یا کئی کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاسی اقتدار: اسے علاقے مثلاً راجدھانی کی بولی معیاری زبان بن جاتی ہے۔ دلی کی اردو، لندن کی انگریزی اور روم کی لاطینی بولیاں اپنی زبان کی معیاری شکل قرار دی گئیں۔ پونا کی مراٹھی بھی اسی وجہ سے معیاری مانی گئی۔

۲۔ کسی مقام کی دینی برتری بھی وہاں کی بولی کو اہم کر دیتی ہے متھرا کی برج بھاشا اور ایودھیا کی اودھی معیاری تسلیم کی جاتی تھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک زمانے میں برج اور اودھی کو زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ امرتسری بولی کو پنجابی کی معیاری زبان قرار دینے کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سکھوں کا مقدس مقام ہے۔

۳۔ جس بولی میں جتنا ادب ہوگا اسی مناسبت سے اس کی اہمیت ہوگی۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں، انھی میں برج اور آج کھڑی بولی سب سے اہم ہے۔ مشرقی ہندی میں اودھی بقیہ دو بولیوں یعنی باگھیلی اور چھتیس گڑھی سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس کی وجہ ان کے ادب کی کیفیت و کمیت ہے۔

اگر کسی وجہ سے معیاری زبان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو وہ محض بولی ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی دوسری بولی معیاری زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ شاہجہاں کے عہد تک جب آگرہ ہندوستان کا دارالخلافہ تھا برج ہندی کا معیاری روپ تھا اور کھڑی بولی محض ایک بولی تھی۔ شاہجہاں نے جب دارالسلطنت دلی کو منتقل کر دیا تو کھڑی بولی معیاری زبان ہو گئی اور برج محض ایک بولی ہو کر رہ گئی۔

معیاری زبان تعلیم و ادب، نظم و نسق، تہذیب اور مجلس کی زبان ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور وقعت روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ یہ مختلف بولیوں کے درمیان مشترک زبان کا کام دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان میں بات چیت کرنا تہذیب اور مرتبت کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور بولی کا استعمال بے تہذیبی و تعلیم و امارت سے بے بہرہ ہونے کی علامت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان شہریوں سے بولیوں کو نکال کر ان کی جگہ پر قابض ہو جاتی ہے۔ بولی میں ادب کی تخلیق رک جاتی ہے۔ اور معیاری زبان ہی ادب کی زبان بن جاتی ہے۔

(ایک مضمون سے اقتباس)

ڈاکٹر عبدالودود

اردو سے ہندی تک

اس مضمون پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی ہے (ادارہ)

اب جب کہ ایک طبقہ اردو کو زبان ماننے ہی سے انکار کر رہا ہے ہمارے سامنے بہت سے مسائل بھی آ گئے ہیں۔ اردو ایک نئی تحریک کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہے۔ اخبارات و رسائل کے ذریعہ اس غیر منطقی اور سطحی خیال کی ترویج کر کے لوگوں کے ذہن پراگندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیشن پال، ناگر اور ان کے ہم نوا اردو کے وجود ہی سے انکار کرتے ہیں۔ ایک طرف قومی یکجہتی کی بات کی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو کو اپنا رسم الخط چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اپنا لینا چاہیے۔ اس سے قومی یکجہتی میں مدد ملے گی۔ تہذیب کے سرسبز و شاداب پودے کی ایک خوبصورت شاخ کاٹ دیجئے اور پھر دیکھیے کتنا خوبصورت پودا ہے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط تجویز کرنے والے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسم الخط بدل دینے سے زبان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ ابھی تو رسم الخط تبدیل ہی نہیں کیا گیا اور آپ نے اردو کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ رسم الخط تبدیل ہو جانے کے بعد تو آپ شاید اردو ہندی کی بحث میں پڑنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ آپ کا واضح اعلان ہوگا کہ اردو ہندی میں ضم ہو چکی ہے۔

بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں، قواعد ایک ہی ہے، جملوں کی ساخت ایک سی ہی ہے اور اردو و ہندی کے افعال بھی ایک ہی ہیں۔ یہ چند دلیلیں یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں کہ اردو و ہندی الگ الگ زبانیں نہیں بلکہ ایک زبان ہیں۔ اردو رسم الخط فضول سا ہے اور اسے ناگری رسم الخط اپنا لینا چاہیے۔ رسم الخط کی تبدیلی سے اردو کا جو حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سیکڑوں سال کی روشن تاریخ ختم ہو جائے گی۔ اردو کی ترقی و بقا کی کوئی صورت باقی نہیں رہ جائے گی۔

ہندی کے پرچارک اردو کو ہندی سے مختلف نہیں سمجھتے۔ اسے ہندی کا ہی ایک روپ کہہ دیتے ہیں۔ افسوس کہ اردو والوں نے اس موضوع پر مفصل اظہارِ خیال نہیں کیا۔ ہندی کے مشہور لکھنے والوں کے اس خیال کو چیلنج نہیں کیا۔ ہم اردو کی انفرادیت، اس کی اپنی اہمیت اور خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن ہندی سے اردو کس قدر مختلف ہے اس کا تاریخی جائزہ نہیں لیتے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے ان خیالات سے ہندی والے واقف ہوں۔ انھیں اپنی باتیں سمجھانے کی کوشش کریں۔ لیکن کسی طرح ہندی کے اخبارات و رسائل ہمارے خیالات کی تشہیر تو کر ہی نہیں سکتے۔ ان سے یہ امید فضول ہے۔ یہ کام اردو ہی کے اداروں سے متعلق ہے۔ ہندی میں مختصر رسالے شائع کیے جائیں اور انھیں مفت تقسیم کیا جائے یا کم قیمت پر فروخت کیا جائے۔ ناگری رسم الخط میں اردو سرمایہ منتقل کرنے والے ادارے بھی اس کام کی پہل کر سکتے ہیں۔

آئیے ذرا ہم دیکھیں کہ ہندی کی عمر کتنی ہے۔ موجودہ ہندی شاعری کی تاریخ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ نثر کی عمر شاعری سے کچھ زیادہ ہے۔ جدید اردو نثر اور ہندی نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہے۔ ہندی نثر کی عمر ہندی شاعری سے پچاس سال زیادہ قرار دی جا سکتی ہے۔ اس طرح ہندی کی عمر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ ہندی والے اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اودھی اور برج کا سرمایۂ شاعری ہندی شاعری تصور کر لیا گیا ہے۔ ہندی والے اردو کے دکنی ادب پر بھی دعویٰ کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ان کا دعویٰ تسلیم ہی کر لیجئے اور ان سے پوچھیے جناب گنگ، قطب شاہ، ملا وجہی ہندی کے شاعر و نثر نگار ہیں۔ امیر خسرو ہندی کے شاعر ہیں۔ انشاء اللہ خاں ہندی کے نثر نگار ہیں لیکن آپ ولی، میر، سودا، آتش، ناسخ، مصحفی، جرأت، میر حسن، دیا شنکر، نسیم، انیس، وہ فوراً غالب، مومن اور ذوق و ظفر کو بھی ہندی کا شاعر کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ انشاء کی رانی کیتکی تو ہندی نثر کا نمونہ قرار دی جاتی ہے لیکن انشاء کی شاعری ہندی شاعری کیوں نہیں مان لی جاتی۔ اس کا جواب نہیں دیا جائے گا اور خاموشی اختیار کر لی جائے گی۔

ہندی کے ادیب اور نقاد ایک زمانے سے اس فکر میں ہیں کہ ہندی کی قدامت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ برج اور اودھی کے شاعر، ہندی کے شاعر تصور کیے جاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ برج اور اودھی کا ہندی سے کوئی تعلق نہیں۔ برج اور اودھی میں جو ادب ملتا ہے آج ان کی کیا حیثیت ہے۔ اسے ہندی ادبیات کا جز تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ آج بھی برج اور اودھی بولی جاتی ہیں۔ ان بولیوں میں آج بھی لوک گیت کہے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہوں کہ لوک گیت کہے جاتے ہیں اور سینہ بہ سینہ محفوظ ہو جاتے ہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ کیا آج برج اور اودھی میں کی جانے والی شاعری، ہندی شاعری کا ایسا ہی جز مان لی جائے گی جیسا کہ سور اور تلسی کی شاعری؟ کیا آج برج اور اودھی نثر میں ایک مضمون لکھا جائے تو اسے ہندی کے مشہور جرائد میں جگہ مل جائے گی؟ یہ کبھی بھی گوارا نہیں کیا جائے گا۔ اس کا بھی کوئی مدلل جواب آپ کو نہیں ملے گا۔

آج بھی سور داس کی برج اور تلسی داس کی اودھی موجود ہے۔ ہندی کے سرمایۂ شاعری میں جن بولیوں کی شاعری شامل کی گئی ہے وہ بولیاں آج بھی موجود ہیں۔ اب یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس ہندی کو ہیں آریائی زبان کہا جاتا ہے اس کا ایک رنگ و روپ نہیں ہے۔ اس کی انفرادیت مشتبہ ہے۔

اردو ہندی سے صدیوں پرانی زبان ہے۔ اردو نے بولیوں پر کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ کھڑی بولی، کھڑی بولی کی شاعری اور نثر، سرمایۂ اردو میں شامل ہیں۔ ہندی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب اردو ترقی کی بلندی پر پہنچ چکی تھی۔ ولی کی زبان پر آج کی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے محاورات روزمرہ اور سلیس انداز بیان نے اسے قبول عام بخشا۔ مثنوی سحر البیان کے بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ترتیب بدل دینے سے وہ عام فہم جملے بن جاتے ہیں۔ ولی سے غالب تک لاتعداد اردو شعرا سرمایۂ شاعری میں بیش بہا اضافہ کر چکے تھے۔ ولی سے پہلے دکن میں اردو شاعری اور نثر کافی ترقی کر چکی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں نظم جدید کی ابتدا کے ساتھ اردو شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ افسوس کہ آج اردو کی سیکڑوں سال کی تاریخ کے روشن صفحات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو عہد اردو کا عہد جدید کہا جاتا ہے اس عہد میں ہندی پیدا ہوئی۔ وہ ہندی جو آج راشٹر بھاشا ہے۔

بھارتیندو ہریش چندر، ہندی کے مشہور نثر نگار، صحافی اور شاعر تھے۔ وہ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۵ء میں ۳۵ سال کی کم عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ہندی کا جو روپ ہم دیکھ رہے ہیں وہ ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مہاویر پرساد دویدی کے عہد میں ہندی بہت کچھ نکھر چکی تھی۔ ہندی کا وجود کس قسم کی ذہنیت کا نتیجہ تھا یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ زبان جو اردو کہی جاتی ہے سیکڑوں سال پہلے شمال و دکن، بہار، بنگال اور گجرات میں نشوونما پا چکی تھی۔ سیاسی حالات نے دیوناگری رسم الخط میں اپنی اردو لکھنے والوں کو مجبور کیا جنھیں عربی و فارسی الفاظ سے دشمنی تھی۔ کوشش کی گئی کہ فارسی و عربی کے عام فہم الفاظ کی جگہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ کو دے دی جائے۔

بھارتیندو کا زمانہ غدر کے بعد کا زمانہ ہے۔ اس وقت تک ہندی نثر کا چلن ہو چکا تھا۔ ہندی شاعری وجود میں نہیں آئی تھی، اب بھی برج کی حکمرانی تھی۔ بھارتیندو کو یہ بات کھٹکتی تھی کہ شاعری اور نثر نگاری میں دو زبانوں کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں۔ یکم دسمبر ۱۸۸۱ء کے "بھارت بندھو متر" میں بھارتیندو نے کھڑی بولی کے چھند شائع کرائے۔ انھوں نے ایک خط بھی شائع کیا۔ خط کے یہ جملے دیکھیے کس قدر ڈرتے ڈرتے بھارتیندو اپنی مجتہدانہ کوشش کا نمونہ پیش کرتے ہیں :-

"یہ چھند سادھو بھاشا (رائج عوامی زبان) میں کچھ کویتا بھی ہے۔ دیکھیے گا کہ اس میں کیا کسر ہے اور کس اپائے (ترکیب) کے اولمبن (استعمال) کرنے سے اس میں کاویہ سوندریہ (شاعرانہ حسن) بن سکتا ہے۔ اس سمبندھ (معاملہ) سادھارن (عوام) کی سمتی (رائے) گیات (معلوم) ہونے سے ایسا پرشرم (محنت) کیا جائے گا۔"

دیکھا آپ نے، اس زمانے میں جب کہ اردو سیکڑوں سالوں کی تاریخ بنا چکی تھی ہندی شاعری گھٹنے گھٹنے چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ برج کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ برج ہی اصل ہندی سمجھی جاتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا اگر برج سے رشتہ ٹوٹ گیا تو ہندی کا نام و نشان ہی مٹ جائے گا۔ ہندی کی تحریک نے بہر حال برج کا نام و نشان تو مٹا ہی دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج برج بھاشا ایک ترقی یافتہ زبان ہوتی۔ کچھ دن پہلے سنا تھا کہ میتھلی کو ساہتیہ اکاڈمی نے ایک زبان تسلیم کر لیا ہے، برج کم از کم یہ مرتبہ تو ضرور حاصل کر لیتی۔

بھارتیندو کی منظوم تخلیقات ہندی کا ابتدائی نمونہ ہیں۔ ان کے خط کے اقتباس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور میں ہندی کا ارتقا کس طرح ہو رہا تھا۔ بھارتیندو کی چند مکریاں دیکھیے۔ یہ ہندی شاعری کا ابتدائی نمونہ ہیں۔ ان کی مکریاں دیکھ کر امیر خسرو کی یاد تازہ ہو جاتی ہے :-

تی تی نت تان سنا دے
اپنے جال میں جگت پھنسا دے
نت نت ہمیں کرے بل سون
کیوں سکھی سجن۔ نہیں کانون (قانون)

سب گرو جن کو برا بتا دے
اپنی کھچڑی الگ پکا دے
بھیتر تتو تجھوٹی تیزی (تیزی)
کیوں سکھی سجن نہیں انگریزی (انگریزی)

---

۱ گرو جن = بزرگ
۲ تتو = حقیقت، مادہ

جس ہندی شاعری کا یہ ابتدائی نمونہ پیش کیا گیا ہے اس کی عمر ابھی سو سال کی بھی نہیں ہے۔ بھارتیندو کے عہد میں برج کی حمایت کرنے والے کم نہیں تھے۔ وہ سنسکرت آمیز کھڑی بولی میں شاعری کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بڑی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ ان کے سامنے صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ کھڑی بولی کا وہ نمونہ موجود تھا جسے اردو کہتے ہیں۔ ان کے ذہن سنسکرت آمیز کھڑی بولی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اردو کا ارتقا فطری تھا۔ اس زبان کی شیرینی کے مقابلے میں اس جدید زبان کی کامیابی مشتبہ تھی۔ ان کا خیال غلط نہ تھا۔ آج بھی اپنی مادری زبان ہندی کہنے والے بہت سے لوگ ہندی شاعری کے مقابلے میں اردو شاعری سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ میں چٹخارہ دار غزلوں کی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ اردو شاعری کے بہترین انتخابات بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ مقبولیت اردو ہی کو حاصل ہوئی ہے سنسکرت آمیز ہندی کو نہیں۔ اردو کی مخالفت تاریخی حقائق سے چشم پوشی ہے۔ حقائق سے واقف ہوتے ہوئے بھی ان کا اعتراف نہیں کیا جاتا۔ زبردستی کھینچ تان کر کے ہندی کی تاریخ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے دکن کی اردو، شمال کی اردو، امیر خسرو کی شاعری، انشا کی نثر (رانی کیتکی)، اردو کے مختلف روپ ہیں ہندی کے نہیں۔ سور، تلسی اور برج و اودھی کے دوسرے شاعر برج اور اودھی کے شاعر ہیں نہ کہ ہندی کے۔ ان زبانوں[1] کا ہندی سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ ہندی کی عمر ایک سو پچاس سال سے زیادہ نہیں۔ ہندی اردو کی ایک دوسری شکل ہے اس کے وجود کی انفرادی حیثیت نہیں ہے۔

[1] میرا خیال ہے کہ برج اور اودھی کو بولی نہ کہتے ہوئے زبان کہنا چاہیے۔ ان کا سرمایۂ شاعری بڑا جاندار ہے۔ ان کی شاعری کی تاریخ ہے ہندی کے آغاز نے ان کی ادبی حیثیت ختم کر دی۔ (عبدالودود)

مراسلات

ایک غلطی کا ازالہ

"اردو ادب" کا نیا شمارہ ملا۔ اس میں حکم چند صاحب نیّر کا مقالہ "سرور جہان آبادی اور شاکر میرٹھی" دیکھا۔

اس مقالے میں فاضل مقالہ نگار نے سرور اور شاکر کے بارے میں بڑی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ لیکن ایک چوک فاضل مصنف سے ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے "موت کی گھڑی" کے عنوان سے جو اشعار نقل کیے ہیں اور جو انھوں نے سرور صاحب کے نام سے منسوب کیے ہیں وہ نہ سرور کے ہیں نہ شاکر کے بلکہ میرے والد محترم صاحب کے ہیں۔

والد کے مجموعۂ کلام "گنج معانی" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے صفحہ ۹۰ پر یہ نظم "موت کا موسم" کے نام سے موجود ہے۔ نیچے لکھا ہے "انگریزی سے ترجمہ" ۱۹۵۰ء میں "گنج معانی" کا دوسرا ایڈیشن دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں یہ نظم صفحہ ۱۶۱ پر موجود ہے۔ میں جب "گنج معانی" کا یہ نیا ایڈیشن مرتب کر رہا تھا تو والد محترم کی بیاض بھی میرے سامنے تھی۔ اس میں سے میں نے یہ فقرہ بھی نقل کر کے مذکورہ نئے ایڈیشن میں شامل کر دیا۔

یہ ترجمہ میں نے زمانۂ طالب علمی میں کیا تھا۔ غلطی سے یہ نظم کسی نے سرور مرحوم کے کلام میں بھی شامل کر دی ہے (محروم)

میں نے جب "گنج معانی" کے نئے ایڈیشن میں شامل کرنے کے لیے والد کا مذکورہ فقرہ ان کی بیاض سے نقل کیا تو ان سے پوچھا کہ آخر سرور صاحب کے کلام میں یہ نظم کیسے شامل ہو گئی۔ آخر ایسی غلطی ہوئی تو کیونکر؟ وہ کہنے لگے۔ یہ غلطی کسی کی نہیں، یہ پیارے لال شاکر کی کارستانی ہے۔ اس کے ساتھ چونکہ میری مدتوں دوستی رہی ہے اس لیے میں اس کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نظم سرور صاحب کے کلام میں اس طرح شامل ہوئی کہ جب والد نے یہ نظم کہی اور شاکر صاحب کو سنائی تو انہیں اس قدر پسند آئی کہ وہ انھوں نے والد سے لے لی کسی رسالے میں چھپوانے کے لیے۔ اور اس رسالے کو اپنے نام سے بھیج دی۔ اور انھیں کے نام سے وہ چھپ گئی (والد کو رسالے کا نام یاد نہیں لیکن وہ زمانہ دہلی ہو گا جیسا کہ نیّر صاحب نے لکھا ہے) جب سرور کا مجموعۂ کلام مرتب ہوا تو جہاں سرور کی اور نظمیں جو شاکر کے نام سے شائع ہوئی تھیں اس میں شامل کی گئیں تو یہ نظم بھی اس ریلے میں آ گئی۔ اور سرور صاحب کے کلام میں شامل کر دی گئی۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے شاکر اور سرور کے وہ تمام واقعات سنائے جن کا نیّر صاحب کے مقالے میں ذکر ہے۔

والد محترم نے یہ بھی بتایا کہ جب سرور کے انتقال کے بعد سرور کے گھر سے شاکر کے وہ خطوط برآمد ہوئے جن سے ان تمام واقعات پر روشنی پڑتی تھی اور "زمانہ" میں منشی دیا نرائن نگم نے وہ تمام خطوط چھاپے تو شاکر صاحب نے جواب میں اپنے ماہنامے کا ایک ضمیمہ شائع کیا جس کا ذکر نیّر صاحب کے مقالے میں موجود ہے۔ شاکر کے اس شعر کے بارے میں:

زمانہ مجھ کو بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
میں جانتا ہوں زمانے کا اعتبار نہیں

والد کی رائے یہ بھی اور ہے کہ یہ شعر بھی شاکر نے کسی سے کہلوایا ہو گا کیونکہ وہ خود شعر نہیں کہہ سکتا تھا۔

والد محترم بہ زمانۂ طالب علمی جب بنّوں (شمال مغربی سرحدی صوبہ) میں مقیم تھے تو شاکر بھی وہیں تھے۔ وہ ایک عیسائی ادارے سے وابستہ تھے اور غالباً ایک ہفتہ وار اخبار مرتب کرتے تھے۔ "مخزن" کے ایک پرانے شمارے میں میں نے شاکر کی ایک نظم دیکھی تھی "تعشّق" اور یہ نظم والد صاحب کے نام منسوب تھی۔ والد کا خیال یہ ہے کہ یہ نظم بھی شاکر نے غالباً سرور ہی سے کہلوائی ہو گی کیوں کہ وہ شعر کہنے پر قادر نہیں تھا۔

شاکر صاحب دو ایک برس پبلیکیشنز ڈویژن دہلی میں بھی ملازم رہے۔ غالباً آپ اسسٹنٹ یا کلرک تھے۔ اردو سیکشن میں اس وقت میں نے انھیں قریب سے دیکھا اور نتیجے پر پہنچا کہ آپ شعر کے کوچے سے نابلد ہیں۔

(جگن ناتھ آزاد)

کچھ "حسرت۔ ایک تاثر" کے سلسلے میں

میں الٰہ آباد گیا تو ایک دوست نے ہماری زبان مورخہ یکم اگست کی طرف توجہ دلائی جس میں ملک اسمٰعیل حسن خاں کا مضمون بعنوان "حسرت۔ ایک تاثر" شائع ہوا ہے پڑھ کر بے حد تاسف ہوا بالخصوص اس سبب سے کہ آپ جیسے فکر و اہل نظر اصحاب کیونکر ایسے غیر ذمہ دار افراد کو اظہار خیال اور حاشیہ آرائی کا موقع دیتے ہیں یہ بھی کیا بات ہوئی کہ ایک شخص راہ چلتے بے خطا لوگوں پر خشت باری کرتا ہوا چلے اور باثر صاحب رسوخ حضرات اس کو روکیں بھی نہیں۔ مضمون لکھا جاتا ہے کسی پر درمیان میں غیر متعلق لوگوں پر بھی نشتر زنی ہو رہی ہے۔ صاحب مضمون نے یک جنبش قلم نوح، حسرت، جگر، سب کو فرسی شاعر ٹھہرا دیا سبحان اللہ ان کی اس بالغ نظری پر! خوب صلہ دیتے ہیں اپنے

بزرگانِ علم و ادب کو لوگ، وہ سرپرستان و محسنانِ علم و ادب جو اپنا خون پسینہ ایک کر کے علم و ادب کی خدمت میں اپنی عمریں تمام کر دیں اور یہ سخن ناشناس و ناقدر فرزندانِ ادب ان کی اس سعیٔ بلیغ کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش سے ذرا بھی دریغ نہ کریں

حضرت نوح ناروی مرحوم کے بارے میں اتنا مزید عرض کروں گا کہ موصوف کے خیالات قطعی غیر منصفانہ ہیں۔ اسمٰعیل حسن خاں صاحب آگے انداز فکر اور طرز سخن سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کے مستند اور استاد وقت ہونے میں کیا شک ہے؟ ان کے مجدد علم و ادب ہونے سے انکار حقیقت کا صریح بطلان ہے۔ یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ شاعر در اصل کس دور کی پیداوار ہے اور اس کے اپنے وقت کے معاصرین کون تھے؟ موصوف نے مرحوم کے اشعار بھی صحیح طور سے نہیں پیش کیے مثلاً یہی شعر

گلزار جہاں میں آئی خزاں پژمردہ غم ہر پتہ ہے
پھولوں کا مجھے افسوس نہیں کلیوں کا قلق البتہ ہے

(سہیل ناروی)
نارا (الہ آباد)

ایک استفسار کے جواب میں

اعجاز کامل صاحب کے استفسار (دہلی اکتوبر) ہماری زبان کے جواب میں عرض ہے کہ یاس یگانہ کی زندگی اور شاعری پر نور الحسن صاحب نے جو کتاب لکھی وہ "کتابی ایجنسی" سرکل نمبر ۱ پہلا مکان۔ حیدرآباد ۲۴ کو ۱.۵۰ (ڈیڑھ روپیہ) بھیج کر حاصل کی جا سکتی ہے۔ کتاب مختصر ہے مگر اچھی ہے۔

(ڈاکٹر جعفر حسن)

فضل المتین کی نظم کے سلسلے میں

ہماری زبان بابت یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جن حضرات نے جناب فضل المتین کی نظم "رات اور دن" کو جناب رئیس احمد اجمیری کی نظم "اگن" کا چربہ کہا ہے ان سے میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں وہ تنقید برائے تنقید نہ فرمادیں۔ رات کے متعلق ہر ذی شعور ایسا ہی سوچ سکتا ہے جیسا ان دونوں شاعروں نے سوچا ہے۔ خیالات کا ٹکرا جانا اتفاق کی بات ہے۔ ذیل کی مثالوں پر غور کیا جائے تو یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے۔

اگر تیری تو یونہی روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

(میر)

جو تو اے مصحفی راتوں کو اس شدت سے رووے گا
تو میری جان پھر کیونکر کوئی ہمسایہ سووے گا

(مصحفی)

ایسی لذت خلش پہلے کہاں ہوتی تھی
رہ گیا سینے میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

(مومن)

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

(غالب)

اردو میں ہی نہیں ایسا عام طور پر مختلف زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً

برا جو دیکھن میں چلا برا نہ ملیا کوئے
جو دل ڈھونڈا آپنا مجھ سے برا نہ کوئے

(کبیر)

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

(ظفر)

کب ہنک اسپ آدمر جائے
میرے پیٹے سدگی سیانی دی کچھو گن گھتا نائے

(تلسی داس)

وہ کب سننے لگے قاصد مگر ہاں یوں سنا دینا
کہ وہ دوسروں کی داستاں ہے داستاں میری

(ذوق)

(نازش شعبہ ہندی چنڈی گڑھ)

تذکرہ مراۃ الخیال

ہماری زبان کے شمارہ ۸ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں جو مضمون "فارسی کا ایک نادر تذکرہ" کے عنوان سے محمد انصار اللہ نظر صاحب کا شائع ہوا ہے ان کی اطلاع کے لیے تحریر ہے کہ یہ تذکرہ "مراۃ الخیال" ہے جو شیر خاں ولد امجد خاں لودی نے ۱۱۰۲ھ میں تصنیف کیا تھا۔ طبع ہو چکا ہے اس کے دو مطبوعہ نسخے یہاں لکھنؤ میں موجود ہیں مگر اب یہ مطبوعہ نسخہ بھی کمیاب ہے

(نور الحسن ہاشمی لکھنؤ)

ایک اعلان

میں عنقریب ہندی رسم الخط میں ایسی نظمیں کتابی صورت میں چھاپ رہا ہوں جو پاکستانی جارحیت سے متعلق لکھی گئی ہیں۔ شعراء صاحبان سے استدعا ہے کہ وہ اپنی گرانقدر تخلیقات اجازت نامہ کے ساتھ مندرجہ پتہ پر بھیج کر شکریہ کا موقع دیں۔

(دلیپ بادل ایم۔ اے
چراغ دلی۔ نئی۔ دہلی)

یوم سرسید

۱۷ اکتوبر ۶۸ء کو یوم سرسید کے موقع پر انجمن اردوئے معلّی شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کا سال رواں کا پہلا جلسہ سرسید کی یاد تازہ کرنے کے لیے عالیجناب فضل الرحمٰن صاحب پرو وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد ہوا۔

سب سے پہلے سکریٹری نے اپنی رپورٹ سنائی۔

عالیجناب فضل الرحمٰن صاحب نے اپنی افتتاحی جامع تقریر میں فرمایا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اس مبارک موقع پر آپ لوگوں نے مجھے یاد کیا۔ سرسید کی علمی اور ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ سرسید کی پیدائش تو ۱۸۱۷ء سے بہت پہلے ہوئی تھی لیکن ان کا ذہنی جنم ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

سرسید کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قوم کو مایوسی، اور ذہنی پستی کے دلدل سے نکالا، اور ایک نئی راہ پر گامزن کیا۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب صدر شعبۂ اردو نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ انگریزوں نے ہندستان کو جہاں اپنی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا وہاں مغربی علوم سے بھی ہندستانیوں کو آشنا کیا۔ مغربی علوم کی بدولت ہندستان کی زندگی کے ہر گوشے میں ایک نیا ولولہ پیدا ہوا، اور اس بنجر زمین میں نئے نئے پھول کھلنے لگے یہ نشاۃ الثانیہ صرف اصلاح مذہب اور تجدید علوم کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اسی مسئلے نے خاص طور سے ہندستان کے جدید ادب میں اظہار و بیان اور سائنسی انداز فکر کے نئے امکانات پیدا کیے۔ سرسید کی اردو تحریک کو اسی نشاۃ الثانیہ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن صاحب اعظمی نے اپنا مقالہ "سرسید کے ادبی تصورات" پڑھا اعظمی صاحب نے فرمایا کہ جدید تنقید کا پودا جو سرسید نے لگایا تھا بعد کو محمد حسین آزاد حالی اور شبلی کے ہاتھوں پروان چڑھا۔

سرسید کے یہاں بھی "نیچر" کا بہت واضح تصور ملتا ہے جب کہ اس سلسلے میں مولانا حالی کا بھی ذہن صاف نہیں ہے۔

سرسید نے انسانی بصیرت کو ادب کے ذریعے سے عام کیا انھوں نے علمی اور ادبی تحریروں میں جو نثر استعمال کی وہ جدید نثر ہے۔

ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب نے علامہ اقبال کی نظم "سید کی لوح تربت" اور مولانا شبلی کی مثنوی "صبح امید" کے اقتباسات اپنے مخصوص اور دلنشیں انداز میں پڑھ کر سنائے۔

جناب مسعود علی صاحب ذوقی نے سرسید کے مختلف مضامین "آخری پرچہ" "مدرسۃ العلوم کی ضرورت" "طریقۂ تناول طعام اور بحث و تکرار" کے اہم اور دلچسپ اقتباسات اپنے مخصوص اور ڈرامائی انداز میں پڑھ کر سنائے جس کو حاضرین نے بہت پسند کیا۔

جناب مجتبیٰ علوی صاحب نے سرسید کی فارسی غزل کو ترنم سے سنایا۔

(امیر عارفی سکریٹری انجمن اردوئے معلّٰی)

علامہ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار کی آخری رسومات

دلی ۱۷ اکتوبر۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی جناب خار دہلوی کے والد بزرگوار اردو کے مستند استاد قادر الکلام شاعر حضرت علامہ پنڈت پروفیسر تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی یادگار داغ کے انتقال کے بعد شانتی کی گیارہویں و بارہویں کی رسومات مرحوم کے مکان پر ۱۶ اور ۱۷ اکتوبر کو تمام دن ادا کی گئیں آل انڈیا ریڈیو اردو مجلس نے علامہ زار کی گیارہویں پر ۱۶ اکتوبر کی شب میں خاص پروگرام نشر کیا جس میں منشی گوپی ناتھ صاحب امن نے آنجہانی کو خراج عقیدت پیش کیا اور ۱۷ اکتوبر کو سنڈے ایڈیشن میں روزنامہ "ملاپ" نے علامہ زار پر خصوصی مضمون و تصاویر اور اداریہ سپرد قلم کیا علامہ کے ساتھ دلی کی آخری کلاسیکل ہستی بھی ختم ہوئی۔

گھر پر ادا کی گئی رسوم میں حبیب ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی ناظم عمومی جمیعۃ علماء ہند نے جمیعۃ کے مرکزی دفتر کے ذمہ داران کے ساتھ شرکت کی۔

دیگر وارد ہونے والے معززین میں خاص طور پر قابل ذکر حضرات میں مندرجہ ذیل احباب بھی شامل ہیں لالہ شام ناتھ نائب وزیر ریلوے ڈاکٹر تاراچند، کرنل بشیر حسین زیدی، منشی گوپی ناتھ امن جناب مالک رام جناب جگن ناتھ آزاد، لالہ دسکار ناتھ ایم۔ پی۔ پروفیسر مولانا عبدالخالق نقوی، ڈاکٹر مہندر سہائے الور جناب ریاض خورجوی راز گوالیار، حاجی محمد صالح صاحب، قاضی مولانا ارشاد علی صاحب مولانا ایوب انصاری، مولانا سمیع اللہ قاسمی، مولانا علیم اختر صاحب، شری جی۔ ڈی گپتا، منشی عبدالقدیر، طالب دہلوی عزیز وارثی، امیر آغا قزلباش، ہیرالال فلک دہلوی۔

.... علامہ زار صاحب کی آخری رسوم تعزیت ان کے مکان پر آج ختم ہوئیں۔

۳۰ اکتوبر کی شام کو دلی پبلک لائبریری میں یوم زار یادگار جلسہ و مشاعرہ آنجہانی کو ادبی خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد ہوگا جس میں "ندائے اتحاد" دہلی کا یادگار سووینیر "زار نمبر" شایع کیا جائے گا۔ (الجمیعۃ)

گزارش: "ہماری زبان" کے لیے مضامین روانہ کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

تبصرے

ڈاکٹر شاہ اولاد محمد صدیقی

"آج کل دستکاری نمبر"

اگست ۱۹۶۵ء۔

مرتبہ و شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا، دہلی۔

آج کل کا دستکاری نمبر ایک قابل قدر کوشش ہے۔ مشینی دور سے پہلے ہندستانی مصنوعات یورپ اور ایشیا کے بازاروں میں مقبول تھیں اور ان کی بڑی مانگ تھی۔ ہندستان میں صنعتوں کی ترقی صدیوں کی کاوش اور دوسرے ملکوں سے صناعوں کی بے روک ٹوک آمد کا نتیجہ تھی۔ مورلینڈ نے لکھا ہے کہ مغلوں کے دور حکومت میں وسط ایشیا، ایران اور دوسرے ممالک سے صناع خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے اور حکومت اور امرا ان کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے تھے۔ اپنے مذاق کے مطابق بادشاہ وقت اور امرا ان سے اشیا تیار کراتے تھے۔ سترھویں صدی کے شروع تک یورپ اور ایشیا کے بازار ہندستان کی چھینٹ، ململ، اور ریشمی کپڑے سے بھرے رہتے تھے۔ ہندستانی تاجر ان اشیا کو فروخت کرتے تھے۔ خلیج فارس اور بحر احمر کی تجارت پر پوری طرح قابض تھے۔ ہندستانی تاجر قندھار، کابل، بخارا، کاشغر، شیراز، اصفہان، باکو اور استراخان میں کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ مشرقی ایشیائی ممالک میں برما، ملایا، انڈونیشیا، چین اور جاپان میں بھی یہ لوگ بڑی تعداد میں نظر آتے تھے۔ روم کے پیر اعظم کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے: "ہندستان کی تجارت دنیا کی تجارت کے مترادف ہے۔ جو شخص اسے مکمل طور پر اپنے قابو میں کرسکے وہ یورپ کا ڈکٹیٹر قرار دیا جاسکتا ہے۔" ہندستان سے جو چیزیں برآمد کی جاتی تھیں ان میں سوتی اور ریشمی کپڑا پہلے نمبر پر ہے۔ مورلینڈ کا اندازہ ہے کہ سترھویں صدی میں سوتی کپڑے کی ہندستان سے سالانہ برآمد آٹھ ہزار گانٹھوں پر مشتمل تھی، جن میں سے پونے پانچ ہزار صرف یورپ میں درآمد کی جاتی تھیں۔ اٹھارویں صدی سے ہندستان میں صنعتیں زوال پذیر ہوگئیں۔ ان میں سب سے بڑی وجہ مشین کی ایجاد تھی جس کے استعمال نے قیمتوں میں بھاری کمی کردی۔ اس کے علاوہ زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے مطابق صناع مصنوعات نہ بنا سکے اور ان کی مقبولیت میں کمی ہوگئی۔

آج کل کے اس نمبر کو پڑھتے وقت ہندستانی دستکاری کے تنوع اور اس کی گوناگوں خصوصیات کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان میں جو مضامین دلچسپ ہیں ان میں ہندستان میں کشیدہ کاری، ہندستانی زیورات، دھات کا سامان بنانے کا ہندستانی فن، ہندستان میں زردوزی کی صنعت، ہندستان میں لکڑی پر کھدائی کا کام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن چند مضامین تشنہ رہ گئے جن میں مٹی کے برتن، جڑاؤ کام، شیشے کا سامان شامل ہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے ان مضامین کو بھی اور مفید بنایا جاسکتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہندستان میں ان صنعتوں کا مستقبل کیا ہے؟ ہندستان میں ہر جگہ اور دارالسلطنت میں بالخصوص گھریلو صنعتوں کے امپوریم کھل گئے ہیں جن کے ذریعہ ان مصنوعات کو مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مگر ان میں خریدار زیادہ تر بیرونی ممالک کے لوگ نظر آتے ہیں اور ہندستانی زیادہ تر تماشائی۔ یہاں ایک خطرہ کی طرف اشارہ کردینا ضروری ہے۔ ان صنعتوں سے ہمارے جذباتی لگاؤ کے پیش نظر گورنمنٹ نے ان کی مصنوعات کی مانگ کو بڑھانے کے دو کام کیے ہیں۔ ایک یہ کہ مشین سے بنائی ہوئی اشیا کی پیداوار پر پابندی لگادی ہے۔ اور دوسرے ان کی قیمتوں میں کمی کرنے کے لیے مدد دینی شروع کردی ہے۔ یہ دونوں اقدام خطرناک ہیں۔ انھوں نے ایک طرف تو مشین سے تیار ہونے والی اشیا کی تعداد کم کردی ہے اور خام اشیا کی کھپت میں اضافہ کردیا ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے محدود سرمایہ میں سے ایک حصہ لے لیا ہے، جو بڑے پیمانہ پر صنعتیں قایم کرنے میں استعمال ہوتا، اور جن سے ہماری ضروریات زندگی کی فراہمی میں آسانی ہوجاتی۔ اگر ہماری منصوبہ بندی کا مقصد ہندستانی عوام کا کم سے کم مدت میں رہن سہن کے معیار کو بلند کرنا ہے، تو ہمیں اپنی سابقہ پالیسی پر نظر ثانی کرنا ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان صنعتوں کو امداد باہمی کے اصول پر چلایا جائے، اور جدید ترین ذرائع پیداوار کا استعمال کیا جائے تاکہ یہ مصنوعات اپنی سابقہ روایات کے ساتھ ساتھ قیمت میں بھی برقرار رکھ سکیں۔ جذبات سے قطع نظر، ہندستان کے صنعتی ورثہ سے واقفیت کا کام مفید بھی ہے اور ضروری بھی، اور یہ آج کل کے اس نمبر سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

اصول معاشیات از پروفیسر عبدالمعز منظر، شعبۂ معاشیات کالج آف کامرس پٹنہ۔ قیمت پانچ روپے

زیر نظر کتاب پٹنہ، گیا اور بہار یونیورسٹیوں کے پری یونیورسٹی آرٹس اور کامرس کے نصاب کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ یہ ایک قابل قدر کوشش ہے۔ منظر صاحب نے بڑی محنت سے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اور معاشیات کو آسان اور دلچسپ مضمون کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ زبان صاف اور سادہ ہے، اور موضوع کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثالیں بھی عام فہم ہیں۔ طالب علموں کے لیے اس کتاب کی قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ امید ہے علاوہ طالب علموں کے، اس مضمون سے واقفیت حاصل کرنے والے دیگر حضرات کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، پرنٹر محمد ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا، پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا